ایک مثالی اُستاد کا کردار اور طریقِ کار

قاضی سعد الدین صاحب

عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اُستاد کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں — ایک مذہبی اُستاد اور دوسرا غیر مذہبی اُستاد۔ یہ ایک ایسی تقسیم ہے جو کسی حالت میں بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔ میرے خیال میں اسلام میں مذہبی (RELIGIONS) اور غیر مذہبی (IRRELIGION) نام کی کوئی چیز اس پس منظر میں نہیں ہے۔ یہاں صرف اُستاد کا کردار اور رویّہ دیکھا جاتا ہے جو کسی مضمون یا علم کے بارے میں مذہبی اور غیر مذہبی یا اسلامی اور غیر اسلامی کہلایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اسلام میں دینی اور دُنیوی علوم کی تقسیم نہیں ہے اور نہ مذہبی اور غیر مذہبی اُستاد کی تقسیم ہے۔ اسلام میں ہر علم اسلامی ہے بشرطیکہ اس کا حامل مسلمان ہو۔ اور ہر وہ اُستاد مذہبی ہے جو مسلمان اُستاد ہو۔ ایک غیر مسلم اگر قرآن و حدیث کا ماہر ہو تو اُس کو صرف قرآن و حدیث میں مہارت رکھنے کی بنیاد پر مسلمان نہیں کہلایا جا سکتا۔ کتنے مستشرقین ہیں جو اسلامی علوم میں ماہر ہیں لیکن اُن کو ان علوم میں مہارت رکھنے کی وجہ سے مسلمان یا مذہبی نہیں کہلایا جا سکتا — اس لیے دینی اور غیر دینی علوم یا مذہبی اور غیر مذہبی استاد کی تقسیم اسلامی تعلیمات کی رُو سے میرے خیال میں مناسب نہیں ہے۔ ریاضی، کیمیا، سائنس اور ٹیکنالوجی کا ایک اُستاد اگر مسلمان ہو، اُتنا ہی مذہبی اُستاد ہے جتنا کہ قرآن و حدیث کا ماہر مسلمان اُستاد۔ اسی طرح قرآن و حدیث کے ایک غیر مسلم اُستاد کا درجہ وہی ہو گا جو دوسرے مضامین کے ایک غیر مسلم اُستاد کا ہوتا ہے۔

یہ تقسیم غالباً اُن نظامہائے تعلیم کی پیدا کردہ ہے جو صدیوں سے ہمارے ہاں رائج ہیں۔
یہ نظامہائے تعلیم بڑے پیمانے پر دو قسم کی درس گاہوں میں پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ درس گاہ ہیں جن کو مدارس کہا جاتا ہے اور جن سے "دینی علوم" کے فارغ التحصیل طلبا نکلتے ہیں اور وہ جو فراغت کے بعد لوگوں کی دینی ضروریات پوری کرتے ہیں۔

دوسری درس گاہیں وہ ہیں جن کو آج کل کی اصطلاح میں سکول، کالج اور یونیورسٹی کہتے ہیں جہاں سے دُنیوی علوم کے فارغ التحصیل طلبا نکلتے ہیں اور جو فراغت کے بعد ملک کے مختلف اداروں میں اہمیت کے حامل عہدوں پر کام کرتے ہیں۔

اِن دونوں درس گاہوں اور ان میں مروج نظامہائے تعلیم کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دینی علوم کے فارغ التحصیل طلبہ، دُنیوی علوم سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں، اور اُن کی یہ ناآشنائی اُن میں دوسرے فریق کے بارے میں غلط تاثرات جنم لینے کا باعث بنتی ہے۔ پھر ان اداروں میں ایسے ادارے بھی ہیں جہاں ایک خاص مذہب اور ایک خاص مسلک اور مکتبِ فکر کی تعلیم دی جاتی ہے اور جہاں دوسرے مذہب اور مکتبِ فکر کے لوگوں کو خصم یعنی دشمن کے نام سے متعارف کرا کے فرقہ داریت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اِس قسم کے طلبا جو بعد میں اُستاد بنتے ہیں، سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ ملک و ملت کے اتحاد اور پیش رفت و ترقی کے لیے وسیع القلبی، اخلاص اور فراخ دلی سے کام کرسکیں گے۔ ان بے چاروں کا سارا وقت تو ایک دوسرے کے کردارکُشی اور بے جا مداخلت میں گزر جاتا ہے۔ اسلام کے لیے بڑے پیمانے پر اور بین الاقوامی سطح پر وہ نہ کچھ کرتے ہیں اور نہ کرسکتے ہیں۔

اِن کے مقابلے میں دوسرا مکتبِ فکر یعنی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والے جو نہ تو صحیح معنوں میں دنیوی علوم سے واقف ہوتے ہیں، اس لیے کہ نظامِ تعلیم مستعار ہے، اور اس میں ایسی خامیاں ہیں جو اُن کو ایسا کرنے نہیں دیتیں۔ پھر دینی علوم سے ان کی ناواقفیت تو ایک مانی ہوئی بات ہے، اور بدقسمتی یہ ہے کہ دینی علوم کی تحصیل ان کو دقیانوسیت معلوم ہوتی ہے اور اس کا ثبوت مسلم معاشرے میں ہر مرد و زن کی روزمرہ زندگی میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اداروں سے جو فارغ التحصیل طلبا نکلتے ہیں وہ ذہنی طور پر

غلام ہوتے ہیں اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے یا کہلانے پر شرم محسوس کرتے ہیں۔

ان درس گاہوں کی تدریس میں یہ نقص بھی ہے کہ جو اساتذہ انہیں پڑھاتے ہیں ان کا نقطۂ نظر لادینی ہوتا ہے اس لیے کہ ان کے علم کی بنیاد لادین فکر اور سوچ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے سامنے سے جو لوگ بھی نکلیں گے وہ دین و ملک کے خیر خواہ کیسے ہوسکتے ہیں۔ وہ اگر چند پیسوں اور ٹکوں کی خاطر اپنا ملک اور اپنا دین نہ بیچیں تو یہ تعجب کی بات ہوگی اور اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ مسلم دنیا میں جتنی خرابیاں پھیل رہی ہیں وہ ان دین اور روشن خیال لوگوں کے ہاتھوں پھیل رہی ہیں۔ عوام الناس کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ صرف موجودہ تعلیم یافتہ اشخاص کے کارنامے ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ اشخاص جن کو نہ کھانا کھانا آتا ہے اور نہ بولنا آتا ہے، یہ ایسے اشخاص ہیں جو ظاہری طور پر تو پاک و صاف رہتے ہیں، کپڑے استری ہوتے ہیں اور جوتے پالش۔ دانتوں کو نمائش کی خاطر خوب صاف بھی رکھتے ہیں لیکن اندرونی طور پر ان کو ٹٹولا جائے تو وہ معنوی پاکی سے عاری ہوتے ہیں ان کی ساری کوشش ظاہری زیبائش و آرائش پر ہوتی ہے۔ معنوی خوبیوں کے لحاظ سے وہ بالکل کھوکھلے ہوتے ہیں۔

اس افراط و تفریط کا علاج کیا ہے؟

میرے خیال میں اس افراط و تفریط کا علاج یہ ہے کہ ان دونوں میں اعتدال کی راہ ڈھونڈی جائے اور وہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں ضروری تبدیلیاں کی جائیں اور "دینی علوم" کے ساتھ ساتھ "دنیوی علوم" کے مبادیات کی تعلیم بھی دی جائے تاکہ مدرسے کے طالب علم کا ذہن روشن ہوجائے اور اس میں دنیوی علوم میں تعلیم یافتہ لوگوں کے بارے میں جن غلط فہمیوں نے جنم لیا ہے وہ دُور ہوجائیں اور اُن کو قرآن پاک کی تعلیم مروجہ طریقے سے ہٹ کر دی جائے تاکہ وہ قرآن کو اس طرح پڑھیں کہ وہ یہ حقیقت ماننے پر مجبور ہوجائیں کہ:

جمیع العلم فی القرآن لکن
تقاصر عنہ افہام الرجال

دوسری طرف سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دینی تعلیم کا بندوبست کچھ اس طرح

کیا جائے کہ وہاں سے فارغ التحصیل طلبا، صرف سائنس دان، کیمیا دان، ماہرین طبیعیات، ماہرین اقتصادیات، ماہرینِ قانون، ماہرینِ سیاسیات اور ماہرینِ حساب نہ کہلائے جائیں بلکہ وہ مسلمان سائنس دان، مسلمان کیمیا دان، مسلمان ماہرینِ طبیعیات، مسلمان ماہرینِ اقتصادیات، مسلمان قانون دان، مسلمان ریاضی دان اور مسلمان استاد کہلائے جائیں۔ اور یہ اس لیے ضروری ہے کہ درس گاہوں میں صرف مدرسینِ دینیات کا تقرر اور ان کا طلبا کو دینی تعلیم دینا کفایت نہیں کرتا اور نہ مطلوبہ ہدف حاصل کرسکتا ہے۔ بلکہ اس کے نتائج بالکل برعکس نکلتے ہیں، جب کہ دوسری طرف دوسرے مضامین کے اساتذہ، جو دینی علوم سے بالکل عاری ہوتے ہیں، اس کے برعکس تعلیم دیتے ہیں۔ مثلاً دینیات کا استاد طلبا کو یہ تعلیم دے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور بیالوجی کا استاد اُس کو بندر کی اولاد کہے یا دینیات کا استاد کلاس میں اسلامی اقتصادیات پر درس دے اور اسلامی علوم سے ناواقف اُستاد مالتھس، لینن اور مارکس کے نظریوں پر ایک داعی بن کر درس دے اور اس سے طلبا کے ذہنوں میں اگر تضاد اور شکوک وشبہات پیدا نہ ہوں تو یہ تعجب کی بات ہوگی۔

اس سلسلے میں ایک دوسری بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ دینی مدارس میں ابھی تک تحریر وتقریر اور تحقیق وتفتیش کا مناسب بندوبست نہیں ہے۔ یہاں ابھی تک اساتذہ کی تقریریں بلاکم وکاست کتابوں پر حاشیوں کی شکل چھڑائی جاتی ہیں۔ تنقید کا مادہ سرے سے موجود ہی نہیں، اس لیے طلباء میں تخلیقی صلاحیت بالکل پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ تقلید جامد کا شعور اور بھی پختہ ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ تو ہے کہ ان مدارس میں صاحبِ تحریر لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔

یہی بات کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی ہے۔ یہاں تنخواہوں کی باتیں تو بہت ہوتی ہیں لیکن تحقیقی کام بالکل نہ ہونے کے برابر ہے اور اگر ہے بھی تو وہ دینی جذبے اور اخلاص سے بالکل عاری ہوتا ہے۔ صرف ڈگری اور تنخواہ میں زیادتی کے لیے کیا جاتا ہے۔ ملک وقوم کو اس سے بہت کم فائدہ ملتا ہے۔ اس کا ثبوت ہم طب، ہندسہ اور دوسرے اداروں میں دیکھتے ہیں جہاں غیر مسلموں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ صرف پیسے کے درپے ہے، اُن کا ان تصنیفات وتالیفات میں کوئی حصہ نہیں۔

ایک دوسری مشکل اس خلیج کو پُر کرنے کے لیے یہ ہے کہ پرائی زبانوں نے ہماری تخلیقی صلاحیتیں مفلوج کر کے رکھ دی ہیں۔ دینی مدارس میں مقامی زبانوں میں کوئی درس نہیں دیا جاتا، بلکہ دوسری زبانوں میں درس دیئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ طلبا کی اکثر صلاحیتیں اور زیادہ وقت زبان سیکھنے پر خرچ ہوتا ہے۔ تخلیقی اور تحقیقی کام کے لیے ان کو وقت بالکل نہیں ملتا۔ جب تک اس کا علاج نہیں ڈھونڈا جاتا یہی خامیاں باقی رہیں گی۔ اس سے میرا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ان زبانوں کی تدریس بالکل بند کر دی جائے نہیں اس کا فیصلہ بہتر ہوگا کہ ماہرینِ تعلیم کریں۔ سرِدست میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ پرائی زبان طلباء کی تخلیقی صلاحیتیں اجاگر کرنے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

اس کے مقابلے میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عام طور پر تعلیم دوسری زبانوں میں دی جاتی ہے۔ ملکی یا مقامی زبانوں میں نہیں دی جاتی۔ یہاں بھی بچے اور طالب علم کی ساری صلاحیتیں پرائی زبان سیکھنے پر صرف ہوتی ہیں۔ تخلیقی اور تحقیقی کام کے لیے اس کو وقت ملتا ہی نہیں مثلاً پاکستان میں سکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم عام طور پر انگریزی یا اُردو میں دی جاتی ہے۔ مقامی زبانوں میں بالکل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلبا کی ساری صلاحیتیں انگریزی زبان سیکھنے پر خرچ ہو جاتی ہیں مضمون کی حقیقت تک وہ سرے سے پہنچتے ہی نہیں۔ طلبا طوطے کی طرح صرف رٹ لگاتے پھرتے ہیں۔ وہ کیا پڑھتے ہیں؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ان کے بس کا کام نہیں ہے۔ جیسے ہم میں اکثر لوگ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں۔ لیکن قرآن کا مطالبہ ہم سے کیا ہے؟ یہ ہمیں قطعی طور پر معلوم نہیں۔ اس لیے جب تک زبان کا مسئلہ حل نہیں کیا جاتا اُس وقت تک ہمارے پاس تخلیقی اور تحقیقی صلاحیت رکھنے والے مسلمان ماہرینِ تعلیم پیدا نہیں ہو سکتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے پاس مسلمان اور تخریبی ذہن رکھنے والے اساتذہ کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ پیغمبروں نے ہمیشہ ہی اپنی قوم کو ان کی زبان میں پیغام پہنچایا ہے، اور اس لیے وہ آسانی سے اس کو سمجھ گئے ہیں اور وہ انہیں آسانی سے سمجھا بھی گیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه ليبين لهم۔

ایک تیسری بڑی رکاوٹ اس ضمن میں ذرائع ابلاغ کا استعمال ہے۔ ہمارے سامنے ذرائع

ابلاغ منفی رُخ اختیار کیے ہوئے ہیں ریڈیو، ٹیلیوژن، اخبارات و رسائل اور دوسرے ذرائع ابلاغ مثلاً وی۔سی۔آر، ٹیپ ریکارڈ، ثقافت کے نام پر منعقد کرنے والی محفلیں وغیرہ مسلمان قوم کو سمتِ مخالف لے جا رہی ہیں۔ یہ سارے اشیاء دیدہ و دانستہ طور پر غلط مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ یہ ذرائع قوم کو ذہنی انتشار اور بداخلاقی کے سوا اور کیا کچھ دے سکتے ہیں اور اس کا مشاہدہ ہم روزمرّہ زندگی میں صبح و شام کرتے رہتے ہیں، جب تک ان ذرائع کے استعمال کی سمت صحیح متعین نہیں کی جاتی، اسلامی ذہن کبھی پیدا نہیں ہو سکتے۔

اب دونوں نظامہائے تدریس کے امتزاج سے جب مسلمان اور تحریکی ذہن رکھنے والے اساتذہ پیدا ہوں تو ان کے اوصاف اور ذمہ داریاں کون کون سی ہوں گی۔ آیئے دیکھتے ہیں ان کے اوصاف کیا ہیں؟

ان اساتذہ کی پہلی صفت یہ ہونی چاہیے کہ وہ دورانِ تدریس اپنی بات کو عقلی اور نقلی دونوں دلائل سے واضح کریں۔ اُن کی بات ایسی ہو جو دل نشین ہو اور جس کو عقلِ سلیم قبول بھی کرے، اور سننے والا اپنے اندر ایک حرکت اور تڑپ محسوس کرے۔ گویا کہ اُس کی دلیل مؤثر اور حقیقت پر مبنی ہونی چاہیے۔ مثلاً دوسری کتابوں کے بجائے وہ قرآن پاک اور احادیثِ نبوی سے استدلال کرے اور جو بھی بات کرنا چاہیں اس کی اصل قرآن اور سنّت میں ڈھونڈے اور ایسا ہونا ممکن ہے مثلاً:۔

اگر عربی قواعد پڑھانا ہو تو وہ ماضی، مضارع اور صیغۂ امر کی پہچان اور سمجھانے کے لیے امرء القیس اور متنبی کے گندے اشعار کے بجائے قرآن پاک اور سنّت سے کام لے۔

ریاضی پڑھانے والا ہو تو اس کے بنیادی ہندسے (ایک سے دس تک) قرآنِ پاک میں پائے جاتے ہیں۔

جغرافیہ پڑھانا ہو تو زمین و آسمان، بادل، بارش اور پہاڑوں کے متعلق آیات اُن کے سامنے پیش کرے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی والا ہو تو سمندروں میں پہاڑوں جیسے جہازوں کے چلنے، سمندروں

سے موتی، مونگے اور تازہ مچھلی نکلنے والی آیات پیش کرے۔ اس لیے کہ پہاڑوں جیسے جہاز آسمان سے نہیں گرتے، بلکہ بنائے جاتے ہیں اور جس طریقے اور ہنر سے بنائے جاتے ہیں اُس کو سائنس اور ٹیکنالوجی کہتے ہیں۔ میلوں گہرے سمندر سے موتی اور تازہ مچھلی ویسے نہیں نکلتی بلکہ اس کے لیے آلات بنانے پڑتے ہیں۔ اور یہی آلات سائنس اور ٹیکنالوجی کے علم کی روشنی میں بنائے جاتے ہیں۔

زراعت بڑھانے والا ہو تو قرآن کی بے شمار آیات ہر چیز میں نر و مادہ موجود ہونے کے قائل ہیں۔ ایک من سے ۷۰۰ من گندم بھی پیدا کی جاسکتی ہے اور ایک آیت کی روشنی میں غلہ محفوظ بھی رکھا جاسکتا ہے۔ اور زوالوجی بڑھانا ہو تو کتنے پودوں کے نام قرآن میں موجود ہیں۔ اور کتنے جانوروں کے نام قرآن کریم نے گن کے لیے ہیں۔ اسی طرح سول انجنرنگ، ٹیکنالوجی، طب، آثار قدیمہ کے علوم، بجلی وغیرہ کے بارے میں قرآنِ پاک میں آیات موجود ہیں۔ الغرض اگر مسلمان اُستاد میں جذبہ اور تڑپ موجود ہو تو وہ ربطِ کربلا سے کام لے کر بھی اپنا مقصد حاصل کرسکتا ہے۔[1] اگر اُستاد صحیح معنوں میں اُستاد ہو، تو وہ ایک غیر اسلامی چیز سے بھی مثبت دعوت کا کام لے سکتا ہے۔

اس کی دوسری صفت یہ ہونی چاہیے کہ اس کا اسلوبِ بیاں حکیمانہ ہو۔ وہ اپنے طلبا کی نفسیات سے واقف ہو۔ وہ ان کے اذہان کے مطابق بات کرے جیسا کہ فرمانِ رسول ہے۔ انزل الناس منازلھم۔ یا کلموا الناس علی قدر عقولھم۔ یعنی لوگوں کے ساتھ ان کی عقلوں اور ذہنوں کے مطابق بات کی جانی چاہیے۔ اسی طرح قرآن پاک میں ہے۔ اُدع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن۔ یہی

---

[1] ربط کربلا سے مطلب یہ ہے کہ ایک شیعہ نے ایک دفعہ کہا کہ وہ کربلا کا واقعہ قرآن پاک کی ہر آیت سے ثابت کرسکتا ہے۔ کسی نے پوچھا۔ سورہ الناس سے ثابت کیجیے۔ اُس نے جواب دیا۔ یہ وہ سورہ ہے جو کہ اس نبیؐ پہ نازل ہوئی ہے جس کا نواسہ میدانِ کربلا میں شہید ہوا تھا۔

وجہ ہے کہ آپؐ اسی طریقے کو درس و تدریس اور وعظ و نصیحت میں اپنایا کرتے تھے۔

ایک اور حکیمانہ اسلوب یہ ہے کہ کسی چیز کو سمجھانے کے لیے سوالات پوچھے جائیں اور اسی طرح ایک اہم مسئلے کی طرف طلبا کی توجہ مرکوز کی جائے۔ ساتھ ساتھ سامعین اس سوال کا جواب سننے کے لیے بے تاب بھی ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا کرنا ان کو متوجہ کرنے کا ایک سبب بھی بنتا ہے۔ ہمارے اداروں میں سوال و جواب کے طریقے کی حوصلہ افزائی تو کیا حوصلہ شکنی کی جا رہی ہے۔ یہ تدریسی میں ہماری ایک بڑی خامی کی نشاندہی ہے۔ راقم الحروف نے ۱۹ سال کی پڑھائی کے دوران ایک طریقہ اپنایا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہفتے میں چار دن نصاب پڑھایا جاتا ہے اور دو دن بحث و مباحثے اور سوال و جواب کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ اس طریقے کا فائدہ یہ ہے کہ شاگردوں کے ذہن میں موجودہ صنعتی دور میں جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں، اُن کا حل آسانی سے ڈھونڈا جاتا ہے۔ آج کل کا ذہن بہت سے شکوک و شبہات میں مبتلا ہے۔ ان شکوک و شبہات کو دُور کرنے اور طلبا کی اسلامی خطوط پر صحیح رہنمائی کرنے کے لیے یہی طریقہ میرے خیال میں بہت اہم ہے۔ اس کے اچھے نتائج راقم الحروف نے محسوس کیے ہیں۔ اور بہت سے شاگردوں نے (جب وہ عملی میدان میں بحیثیت معلّم آچکے ہیں) اس حقیقت کا اقرار کیا ہے کہ نصابی کتب کی پڑھائی کے مقابلے میں بحث و مباحثے اور سوالات و جوابات کی کلاسوں کا اُن پر بہت زیادہ فائدہ ہوا ہے۔ اور وہ اس کی افادیت کلاس میں محسوس کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں (   ) کا طریقہ اگر یہ رائج کیا جائے تو زیادہ بہتر اور مناسب ہوگا۔ اس کے مقابلے میں آج کل جو ادارے موجود ہیں۔ وہ خانقاہیں اور آستانے ہیں۔ اسی طرح بعض گھرانے بھی یہی کام انجام دیتے ہیں۔ لیکن اِن سب کی حیثیت یہ ہے کہ موجودہ ذہن کو اطمینان بخش جواب نہیں دے سکتے اور نہ اُن کو قائل کر سکتے ہیں۔ بلکہ اُلٹا اُن کے شکوک و شبہات میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس لیے ایک مسلمان استاد ہی یہی فریضہ کلاس میں بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے۔

یہ کام ایک دوسرے طریقے سے بھی کیا جا سکتا ہے اور وہ ہے ضروری مسائل کی نشاندہی کر کے کتابی شکل میں اُن کے جوابات کا انتظام کرنا۔ یہ طریقہ بہت مفید ثابت ہوا ہے مثلاً

آج کل سید قطب، محمد قطب، ابوالحسن علی ندوی اور ابوالاعلیٰ مودودی کی تصانیف و تالیف یہ کام بطریق احسن انجام دیتی ہیں۔

تدریس کا ایک اور حکیمانہ اسلوب یہ ہے کہ کسی بات کو مجمل اور تفصیل طلب نہ چھوڑا جائے بلکہ اس کی پوری وضاحت کی جائے، اور جب تک سائل مطمئن نہ ہوں، وہی بات سمجھائی جاتی رہے۔

ایک اور طریقہ یہ ہے کہ مثالیں دے کر بات سمجھائی جائے۔ مثلاً المومن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضاً یا تری المؤمنین فی تراحمھم وتوادھم وتعاطفھم کمثل الجسد اذا اشتکی عضو تداعی لہ سائر الجسد بالسھر والحمی۔

ایک اور طریقہ یہ ہے کہ پڑھانے والا یا داعی خود بلند اخلاق اور مثالی عمل کا ایک اعلیٰ نمونہ ہو۔ جو کچھ وہ پڑھاتا ہو یا وہ جس بات کی طرف دعوت دیتا ہو۔ پہلے وہ خود اس کے اپنے عمل سے ظاہر ہو۔ اس لیے کہ جب تک کسی شخص کے گفتار و کردار میں تضاد ہو، اس کی بات کبھی مؤثر نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہ اُلٹے نتائج مرتب کرتی ہے۔ اس لیے صرف تقریروں سے کام نہیں بنتا۔ مدرس اور داعی کا مؤثر اسلحہ یہ ہے کہ وہ خود عمل اور کردار کا ایک مثالی نمونہ ہے۔ پھر اس کی بات مطلوبہ نتائج پیدا کر سکے گی۔ ورنہ وہ اس آیت کا مصداق ثابت ہوگا کہ لم تقولون ما لا تفعلون۔ کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون۔

اُستاد یا داعی کو نرمی، حلم، عزم و استقلال اور ثابت قدمی کا ایک مظہر ہونا چاہیے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے لوگ پروانوں کی طرح ان کے عاشق بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک۔ اُستاد یا داعی کو اپنے سامعین کے ساتھ باپ جیسا سلوک کرنا چاہیے۔ ان کو اُن کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنا چاہیے۔

اِسی طرح وہ کسی کو اُس کی کوتاہی کی وجہ سے لوگوں کے سامنے ہدف ملامت نہ بنائے۔ اس

سے اس کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے ۔ اس کو اس کی کوتاہی کی نشاندہی ایک عام انداز میں کرنی چاہیے ۔ اس طرح اس کو اپنی کوتاہی بھی معلوم ہو جائے گی اور اس کی عزتِ نفس بھی محفوظ رہے گی ۔

درس و تدریس اور وعظ و نصیحت میں اس بات کا خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ سامعین تنگ نہ ہوں ۔ اس لیے وہ اپنے سامعین کے اوقات اور برداشت کو ملحوظِ خاطر رکھے ۔

مدرس یا داعی کو بعض چیزوں کو فتنہ اُٹھنے کی خاطر چھوڑنا چاہیے اور اس کی تدریس اور تبلیغ سے اجتناب کرنا چاہیے ۔

اگر ہو سکے تو طلبا کی مالی مشکلات بھی دُور کرنے کی کوشش کرے ۔ اس طرح مستحق طلبا کی مدد بھی ہو سکے گی اور اُن کی دلجوئی بھی ہو جائے گی ۔ کسی کو متاثر کرنے کے لیے یہ ایک مؤثر طریقہ ہے ۔

وہ اپنے طلبا سے محبت اور شفقت سے پیش آئے ۔ اسی طرح اس کو عفو و درگزر سے بھی کام لینا چاہیے ۔ اس کو کبھی اپنے شاگرد سے ذاتی انتقام نہیں لینا چاہیے ۔ انتقام لینے کی جگہ معاف کرنے کا اصول اپنائے اور اگر اس کی طرف سے غلطی ہو جائے تو اس کے بدلے اس کے ساتھ احسان کیا جائے ۔

شاگرد کی طرف سے اگر اذیت مل جائے تو اس کو برداشت کرنا چاہیے ۔ واللہ اعلم بالصواب وما علینا الا البلاغ ۔

ضروری اعلان

خط و کتابت کے لیے ادارہ ترجمان القرآن پوسٹ بکس نمبر ۱۴۴۳ لاہور ۲ تحریر کریں ۔

(ناظم ادارہ)